

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سلسلہ ۳

میری علمی و مطالعاتی زندگی کے زیر عنوان پیش نظر
مضمون میں عالم اسلام کے فرزند جلیل داعی کبیر مولانا
ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (صدر ندوۃ العلماء کمشنر) نے
سوالنامہ کی اس شق کے بارے میں روشنی ڈالی ہے جس
میں شخصیت پر اثر انداز ہونے والی محسن کتابوں کے
بارے میں دریافت کیا گیا تھا۔ گویا مولانا کے اس پر مغز
اور معلومات آفرین مضمون میں ان کی عمر بھر کے علمی
اور مطالعاتی زندگی کا عطر کشید ہو چکا ہے۔ لیجئے
مشام جان معطر کیجئے۔ مولانا جیسے کثیر الاشغال
شخصیت پر صنعت و غلات کے باوجود اتنی
توجہ اور کرم فرمائی؟ یہ سب اس علمی جذب و شوق
اور اس دینی درد و سوز کے کرشمے ہیں جسکی شعاعوں
اور جس کی حرارت سے سحر ف عالم اسلام بلکہ دیرپ
کے بیشتر مسلمان بھی اپنے دلوں میں ایمان و یقین کا
نور اور دعوت و عزیمت کی گرمی محسوس کر رہے
ہیں۔ (سمیع الحق)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید
ہے کہ آپ اور حضرت مولانا بخیر و عافیت
ہوں گے۔ میں اکتوبر کے دو ہفتے ہسپتال رہا
رمضان المبارک سے چند دن پیشتر گھر آیا،
ہسپتال ہی میں مضمون پر نظر ثانی کا کام شروع
کر دیا تھا۔ اب اس کو صاف کر دیا کہ۔ آپ
کے پاس بھیج رہا ہوں۔ اس میں معتد بہ اضافے
ہوتے، خدا کرے آپ پسند کریں۔ بہر حال
میں اپنے وعدہ سے سبکدوش ہو گیا۔ اسی مضمون
کی رسید سے غمزدہ مطلع کریں۔ جی دیکھا رہے گا۔
حضرت والد صاحب کی خدمت میں
بہت بہت سلام اور درخواست دعا۔

والسلام

مخلص

۱۳۹۱ھ
ابوالحسن علی ۲۰ مارچ رمضان

۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں رسالہ "الندوۃ" کی طرف سے جس کا مولانا سید سلیمان صاحب
ندوی کے حکم و تحریک سے تیسری بار اجراء کیا گیا تھا، اور وہ اقم سطور، اور رفیق محترم

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سابق استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء (حال ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ شاہیر اہل علم و اہل فکر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ طلبہ اور اہل ذوق کے فائدے و رہنمائی کے لئے ان کتابوں کا تذکرہ فرمائیں جنہوں نے ان کی ذہنی، علمی، دینی، و اخلاقی تشکیل و تعمیر میں خاص حصہ لیا، ہندوستان کے قدیم و جدید شاہیر و فضلاء نے اس دلچسپ و مفید بحث و مذاکرہ میں حصہ لیا۔ ان کے مقالات ”الہدوہ“ میں شائع ہوتے رہے، بعد میں ”شاہیر اہل علم کی محسن کتابیں“ کے نام سے یہ مجموعہ شائع ہو گیا۔

بعض احباب کے اصرار سے راقم بطور نے بھی (جس کی عمر اس وقت ۳۳ سال کی تھی، اور اسکی علمی و تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔) طلبائے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فائدے اور دلچسپی کے خیال سے اپنے تاثرات و تجربات قلم بند کئے، وہ مضمون اسوقت دارالعلوم کی مجلس علمی میں سنایا گیا، اور ان معنائیں کے مجموعہ میں بھی شامل کیا گیا، اب محب گرامی مولانا سمیع الحق صاحب کی خواہش و فرمائش پر اس پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ اور جا بجا اضافے کر دئے گئے ہیں، لیکن جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ تقریباً وہی ہیں جنہوں نے ۳۵-۳۶ سال کی عمر تک متاثر کیا، کہ یہی زمانہ ذہنی نشو و نما اور ارتقاء کا تھا، اس کے بعد جو کتابیں تحقیق و تصنیف اور تدریس کے دوران مطالعہ میں آئیں ان کی تعداد بہت زیادہ اور ان کے متعلق اظہار خیال بہت مشکل ہے۔

مضمون کے مطالعہ کے وقت یہ ملحوظ رہے کہ اس کا طرز واقعاتی اور سوانحی ہے، تنقیدی اور تحقیقی نہیں، اس لئے ذہن پر مطالعہ کے جو اثرات پڑے ان کو بے تکلفی، اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ مصنفین کے خیالات، مسلک اور طرز فکر کی پوری ذمہ داری نہیں لی گئی، اور نہ کسی ایسی کتاب اور مصنف کا ذکر حصص اس کے مفید یا بلند پایہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے، جس کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی، یا ذہن و شعور نے اس سے کوئی گہرا اور دیر پا تاثر قبول نہیں کیا، اس لئے اس فہرست میں سے کسی کتاب یا مصنف کے نظر انداز ہوجانے کے معنی اس کی عدم افادیت، یا تنقیص نہیں ہے۔

(الرحمن علی)

ناکسار کا خاندان ایک خزاں رسیدہ دینی خاندان ہے جس کے بزرگوں نے کبھی فصل خزاں میں بھی

دنیا کو پیام بہار سنایا تھا، ہندوستان میں جب دین کی بہار آثر ہوئی تو اس خاندان پر بھی تنزل آیا، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دین واری جھلکوں سے زیادہ جڑھوں میں، اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ نے ۱۹۲۳ء کے شروع میں انتقال کیا، میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، میرے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالحی صاحبؒ کھنڑ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا، اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کی کتابیں پڑھتا تھا۔ اور کھنڑ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

وقت میں سارے ہندوستان کو گرا دیا تھا، اس لئے نظم میں ہوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت خالدؒ سے شاعر کو مشت تھا، اور خواب میں بار بار ان کی زبانی ہوتی تھیں، اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے۔ وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی خالد سیدہ صالحہ مرحومہ جو قرآن مجید کی بھی حافظ تھیں یہ منظوم ”فتوح الشام“ بڑے پُر اثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں، اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہو گئی تھی، عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لئے آ جاتے، اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بارادہ بیٹھ جاتے، اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتی، پھر جب اس میں لطفت آنے لگتا تو کھیل بھڑک کر اس مجلس میں شریک ہوتے میری خالدہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً نصفانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و مشفقہ کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں، اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلاوی م ۱۳۲۴ھ - ۱۹۱۹ء) کی منظوم ”فتوح الشام“ پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق صاحب کلاوی مرحوم حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہم شیر زادہ منشی سید حمید الدین صاحبؒ کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمن صاحب کے نواسے تھے، دافدیؒ کی عربی ”فتوح الشام“ کو کلاوی صاحب نے بڑی قاعدہ کلاوی، اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچیس ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے، چونکہ ان کو اس کا طبعی ذوق تھا، اور جہاد و ہرابت ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی، جس نے ایک

اس لئے یہ کتاب بڑی تعلیق پر مصصام الاسلام کے نام سے مطبع نولکشور، کھنڑ کی طرف سے شائع ہوئی تھی، بہت سے دیندار خاندانوں میں اس کی شہرت تھی۔

ہو گیا، جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و معاملات کبھی غالب نہیں آسکتے۔

اس وقت شرفا کے خاندانوں میں ”مسدس حال“ کا نام دراج تھا، اس کے اشعار لوگوں کے ذہن زبان تھے، تقریروں اور براعظم میں جا بجا اس کے اشعار کے کام لیا جاتا، معنایں میں نقل کئے جاتے۔ میں نے

بھی ”مسدس“ کو بڑے جوش و طغوت سے بار بار پڑھا اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں، اور ان انعامی معنایں میں جو مقابلے کے لئے لکھے جاتے، بار بار نقل کئے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر ”مسدس“ کا اچھا خاصہ اثر

رہ چکا ہے، عام استعداد و معلومات میں اعصاب کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی موزنین مصنفین کی یہ کوشش باطل ہے اثر رہی، کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خوردبین سے دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی، اور کوہ آتش نشاں پھٹنے کو تھا کہ مروج شناسی سے برکت اسکو چنگاری دکھا دی گئی، اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی اہمیت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا عالی کے ان پر اثر اور سادے چند بند پر غالب نہ آسکی جن میں انہوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اسکی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے۔ نہ بعض قوم پرست عربوں کے

لیکن پر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں، تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ، حضرت صرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہ بنت اللہؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ، و مجاہدین شام کی جانبازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر یکسک کھیت و سودا اور نشہ سا طاری ہو جاتا، کسی سخت موکہ میں مسخروں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی بھر پائی لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا پھینٹا ہلے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا، اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا، ”فتوح الشام“ کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق اور جہاد کو مدافعت ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی، خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکے، جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کئے جاتیں، پھر وہ نقش جبکو بچپن کے پاک آنسوؤں نے بیداری بخشی ہو۔

انانی ہوا ہا قبل ان اعرف الموتی

مضاد قلباً خالیا فتمکنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب کے خلاف (عیسائیوں) جن کے مقدم میں قیامت تک کیلئے اسلام کا عالم گیر حریف و مد مقابل بنا لکھ دیا گیا ہے اور جسکی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے۔ ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا

معنا میں اور تالیفات متاثر کر سکیں جو اپنی قومیت کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے دانت کدنے لگتے ہیں۔ اور اس کے روشن پہلو کے دکھانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

میرے گھر کا مولیٰ دادا صاحب (مولوی سید غزالدین صاحب خیالی)، اور والد صاحب کی وجہ سے جو جدید عالم اور عربی کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے دینی کے ساتھ ادبی بھی تھا، بہت بچپن ہی سے اردو نثر و نظم کی دسی اور غیر دسی کتابیں ہم بھائی بھندوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سی کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں، اس زمانہ میں عام طور پر مولوی اسماعیل صاحب بیرٹھی کا اردو نصاب ”گلک اردو“ ”سواد اردو“ اور ”سفینہ اردو“ رائج تھا۔

ہندوستان کا سرشتہ تعلیم ان کتابوں سے بہتر کتابیں مرتب نہیں کروا سکا، ان میں ”سفینہ اردو“ کا اثر آج تک دل و دماغ پر باقی ہے، تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد، اور ذہنی طور پر وارتقاء کے بہت سے منازل طے کر لینے کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آ جائے (جو افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے) تو شاید سب کام چھوڑ کر اسی کو پڑھنے لگیں، اور بچپن کی یاد تازہ کروں، اور کم سے کم اپنی چند پسندیدہ نظمیں اور غنائیں مولوی طغر علی خاں بی۔ اسے علیگ

کی نظم ”راہ و سرت کی کہانی“ امد حیدر آباد کے طوفان پران کی نظم ”اوناماردندی“ سید سجاد حیدر یلدرم کا مضمون ”مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ کو ایک بار پڑھے بغیر ہاتھ سے رکھنی مشکل ہو جائے، اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا لطیف اور ذوق زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا، اور تحریر انشاء میں کبھی مولیانہ خشکی پیدا نہ ہونے پائی، میرے خیال میں ابتدائے عمر میں سلیس و شگفتہ زبان اور اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا، جو سلیس و شیریں زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، ورنہ نئی نسل، اور نئے عہد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور دعوت و تلقین کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا، اللہ جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ قاضی سلیمان صاحب منصور پوری مرحوم کی ”سیرت رحمۃ العالمین“ کا پہلا حصہ ہے، مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اس کی دونوں جلدوں کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ دی۔ پی پرائسے بریل آیا ہے۔ اور اس کے پھر اٹنے کے لئے اس وقت روپیہ نہ تھا، تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا، اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی، بار بار پڑھی، کئی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا

بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا ، اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات حضرت مصعب ابن عمیرؓ کی مکی زندگی کا مقابلہ، ان کی داہانہ کیفیت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری، اور حضرات انصار کی مسرت، استقبال اور جان نثاری، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات و حالات کا دل پر خاص اثر پڑتا تھا، ٹہل ٹہل کر ان کو پڑھتا تھا لوگوں کو سنا تا تھا، اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں پیدا ہوتی تھیں، قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے، اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے، اس نے سب سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا، جس کے بغیر یہ زندگی خاک اور عالم نفس و خاشاک ہے۔
در خرمن کائنات کریم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہر گاہ

انہیں دنیوی کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی ”الفاروق“ آگئی، مطبع نامی، کانپور کی چھپی ہوئی، سراپا تصویر پڑھی اور کئی بار پڑھی، عراق کی جنگوں بربیب، جسر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے، شاید اس سے زیادہ اثر فرمائی ”شاہنامہ“ میں مسلسل اشعار اور پرشکوہ

الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کر سکا، ”الفاروق“ کے جان دار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر و سنان کا کام کرتے ہیں، مولانا نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے۔ اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی، اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے، لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا، اور اب بھی ہے۔

مولانا کی دوسری کتاب جو اس دور میں پڑھی، ”سفرنامہ روم و مصر و شام“ تھی، اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاہوں کے محدود ذخیرہ کتب میں تھیں، آخر الذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، اور کیا عجب ہے کہ اول اول اسی کتاب سے دنیا نے اسلام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا ہو۔ جس کی نوبت برسوں بعد آئی، کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات ”الغزالی“، ”سوانح مولانا روم“ اور ”الامون“ پڑھی۔ غالباً اسی

وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا، کہ سوانح حیات اور غیر ارادی طریقہ پر ان تذکروں اور ”تاریخ دعوت“ عزیمت کے سلسلہ میں جو راقم کے قلم سے نکلا، اس کو اختیار کیا گیا، افسوس ہے کہ ”شعر العجم“ کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی، جسکو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں، اس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا۔

عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب حسنی مرحوم ایم۔ اے۔ استاد اور نٹیل کالج لاہور کی صحبت اور

اور تذکرہ نگاری کیلئے اس سے بہتر اسلوب اور زبان صوبیدار و درویش پائی نہیں جاتی

اس سلسلہ میں خاص طور پر مومن، غالب، ذوق اور لکھنؤ کے شعرا میں سے آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے، اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی، اس زمانہ میں اردو میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گادوں میں کی مشاعرے ہوتے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جوڑائے خیر دے کہ انہوں نے بہت سستی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرہ کتب تھا، جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی نیزنگ خیال بھی تھے، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر اردو کا ایک مرصع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا۔ بہت دنوں تک نیزنگ خیال اور ”آب حیات“ کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سواد کی بے باوجود فائدہ سے غالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر پھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، شر مرجوم، اور رتن نامہ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے، بیکار، و بے اثر نہیں رہتی اپنا اچھا بڑا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں

بجھوں میرا آج حیات سے تعارف ہوا، سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے معنائیں مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گیا، جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں، اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔ محلِ رعنا گھر کی کتابت تھی اسکو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ، اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئی کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برق لکھنؤ کی ٹکسال زبان کہتے اور بولتے تھے، لکھنؤ کے محاورات، اور صحت و صفائی زبان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھے، سنسن شناس بھی تھے اور سخن سنج بھی، ابتدائی شمس لکھنوی کو کلام دکھاتے تھے، پھر آغا تاقب قرلباش لکھنوی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے، اور انہیں کے رنگ کی پیر دہی کی، ان کی صحبت میں زبان کا ذوق، اور اچھے برے کی نیز پیدا ہوئی، ان کے چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمن بامعہ طبع میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا، ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے امائدہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے،

بڑھتے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔
اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم
کی کتاب ”یاد ایام“ کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک
شگفتہ نمونہ ہے اور جس میں تاریخ کی مناسبت
کے ساتھ، زبان کا باکپن بھی موجود ہے، جو میرے
علم میں صنف ”گل رعنا“ اور نواب صدیق جنگ
مولانا حبیب الرحمن خاں شیرانی کی تحریر کا مشترک
جوہر ہے، اس طرز پر میرا پہلا مضمون جواب یاد
آتا ہے ”ایڈس“ پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے
استاد شیخ خلیل بن محمد بن شیخ حسین اپنی (محدث
بحوالہ) نے ہمیشہ کے لئے دل پر توحید کا نقش
قلم کر دینے کے لئے سورہ زمر بڑی توجہ اور
ذوق و شوق سے پڑھائی، عربی ادب، اور
بالخصوص عربی شعر کا عرب صاحب مرحوم کو اللہ
نے ایسا فطری ذوق بخشا تھا، جس کی نظیر ملنا
مشکل ہے۔ وہ اس قوم کے فروختے، جس کے
متعلق زبان نبوت نے شہادت دی ہے، کہ
ایمان اس کے گھر کی دولت ہے، (الایمان یان)
عجم کا حسن طبیعت ”ثانی ہال“ سے اور عرب کا
”سود دروں“ انہوں نے وادی ہال سے پایا تھا،
قرآن مجید پڑھتے تھے تو خود بھی روتے تھے، اور
دوسروں کو بھی رلاتے تھے، قصائد پڑھتے تھے،
تو شوق کا کلام کا نقشہ کھینچ دیتے تھے، توحید
ان کا ذوق مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا، اوّل

کو توحید کے لئے کھول دیا، وہ دن ہے اور آج
کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے: اللہ الدین
المخلص: (سورہ زمر) کا نقش قائم ہے۔ اور
اس کے سامنے ”ما نعبدہم الا لیقربونا الی اللہ
زیلنا“ (زمر)۔ (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے
معبودوں کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ
ہم کو خدا کے قریب کر دیں) کا حیلہ اور دعویٰ،
جو ہمیشہ کے نظام شرک کا سب سے بڑا فلسفہ
ہے، تاریکیوں میں معلوم ہوتا ہے، ادب میں شیخ
خلیل عرب کا ایک مجتہد تھیں، صاحب تھا، جو ہندوستان
میں بالکل نیا تھا، ان کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف
منتقل کرنے میں خاص کمال تھا، انہوں نے مادی
حرف اور تحریر و انشاء کی مشق کے ساتھ محرو
بیروت کے سلسلہ قرائت (ایڈس) المطالعة
العربیہ، الطريقة القبرہ، ۱۵ اجزاء، مدارج العزیز
۱۔ بزرگ کے بعد ابھرتے ہوئے کی ”کلیلہ و دمنہ“، ”مجموعہ
من نظم والنثر“ حصہ نشر کا ایک حصہ حفظاً اور
حصہ نظم، پنج البلاغۃ حصہ کتب، اور نظم میں
کاسہ، اور معری کی سقط الزند اور دلائل الاعجاز
لجعربانی بڑے ذوق و جوش سے، تیز مختصر تاریخ
آداب اللغۃ العربیہ پڑھائی، عربی کے قواعد
زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اس گمنام
کے نامور ہمنام ابوالحسن علی المصیری کے رہالہ الصیری
کا ہے، جو چند اوراق کی کتاب ہے، عرب صاحب
نے اسکی عملی مشق کرائی، اور یہی مشق اس وقت

نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی ان صاحب طرز انشاء پر دازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح بڑا کر انعام حاصل کیا،

اس تعلیم کے انتہائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحب طرز نثار سید مصطفیٰ لطفی المتفوطی کی کتاب "المنظرات" عرب صاحب نے دیکھنے کو دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا، اس کے غنائوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار رہوار کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی۔

میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حمید حسن خاں صاحب جیسا متبحر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطیف صاحب کوٹلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین عینی کے شاگرد، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہاجر کی کے مجاز تھے، یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی، تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے۔ اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی مآخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دوسری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ (بہ قدر استعداد و توفیق) عملی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا، ایک یہ کہ

تک کام آ رہی ہے، اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی، کہ اس میں ایک وقت میں مختلف علوم و فنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی، صرف عربی زبان و ادب کی تعلیم تھی اور وہی اور دماغ بچھونا، وہی مقصد حیات اور وہی ذوق طبع۔

عرب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب و منتخب مصنفین، اور ان کے محبوب و منتخب تصنیفات کو اس طرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے، گویا وہی زبان و ادب اور طرز ادا کا واحد نمونہ اور ادب و ذوق کا منہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر عوامی ہر جہت سے تھے، اور غالب علم ان کا رنگ اتارنے لگتے تھے، ابن المقفع، اور حافظ نثر میں، عبد القادر جرجانی ذوق، نقد ادب اور سخن نہیں میں، مثنوی و بختری شعر میں ان کے منتخب لوگ تھے، اس لئے ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور انداز پیدا ہو جائے، راقم الحروف نے ابن المقفع، اور صاحب پنج البلاغۃ، نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی، اور اس کا بڑا فائدہ ہوا، عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا، کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے، کہ ادب و نثر کا ترکہ صاحب ذوق طلبہ کی میراث ہے، جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انہیں باک

تعلیم بالکل ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر مبنی، مولانا کو مذہب حنفی پر کلیۃً اطمینان تھا، اور وہ اس کے زبردست وکیل و ترجمان تھے، لیکن ان کا درس حدیث محدثانہ طرز اور نقد حدیث، اصول حدیث و رجال کی بحثوں پر مبنی تھا، اور اس میں ہندوستانی طرز تدلیس حدیث سے زیادہ یعنی طرز حدیث، اور شواہد کافی کے طرز تالیف کا اثر تھا۔ شواہد کافی کی تالیف "نیل الادبار" اس کا ایک نمونہ ہے، محدثین میں خصوصاً ابراہیم الوزیری، محمد بن اسماعیل الامیر، اور علامہ نقی کی تالیف، اور اصول حدیث کے بعض نوادہ ان کے خاص مآخذ تھے، جن میں "تفتح الانظار" اور "توضیح الافکار" کے قلمی متن و شرح کے مسودات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترمذی کی "المجہز النقی" امام زبائی کی نصب اللہ سے بہت مدد لیتے تھے، اور حدیث صحیح کا بواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے مسلمہ اصول و محدثانہ مباحث سے دیتے تھے، دوسری چیز یہ کہ ان کا درس علمی تھا، جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے، مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکالتے تھے، اس طرح تدلیس و تالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔

درس حدیث میں علمی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نزدیکی کی شرح مسلم سے ہوا،

جو ایک مبتدی طالب علم کے لئے بڑا اچھا استاد ہے، شروع حدیث کے فائدے اٹھانے اور ذہن پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا، "فتح ابدی" سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں ہوتی، اس وقت حافظ ابن حجر کی وسعت نظر، فن حدیث پر ان کی قدرت، اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے، جس کی نظیر سے دوسری متون کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں دھند و سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر "ابوداؤد" کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب "الزہد والرقاق" نے ڈالا۔ اسی زمانہ میں "احیاء العلوم" دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا، اس میں بڑے بھائی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس ادب کے لئے ایک فاضل و محقق صاحب زبان مراکشی عالم تشریف لائے، یہ علامہ شیخ تقی الدین ہلالی تھے، جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و دیہیات

زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول نظر سے پیشہ اور مجمل رہتے، اور عجیت و بندیت کے اثر سے کلیتہً آزادی نصیب نہ ہوتی، ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا، تو قرن ثانی و ثالث کی زبان کو مردہ اور صرف کاغذ کے نقش و نگار سمجھتے، اس ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع (عدم تحقیق کی حالت میں بے تکلف لاادبی کہہ دینا) مغرب اقصیٰ خصوصاً اہل شفیق کا حفظ و استحضر، اہل لغت کا اتقان، علمائے نحو کی پیشگی، اور اہل زبان کی شیریں نوائی اور خوش گھناری جمع تھی، بات کرتے تھے تو منہ سے پھول بھڑکتے تھے، ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا، جس کو آدمی جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے، میں نے ”اغانی“ اور ”مباحظ“ کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سنا، جو کہتے تھے، وہی بولتے تھے، اور جو بولتے تھے وہی عربی زبان کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔

ہلالی صاحب سے عربی ادب و شعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت اور مجالس و سفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت و افادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں، ایک تو یہ کہ زبان، اور ادب میں فرق ہے، زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان

کی بنیاد کے کاغذ و ایران اور زبان کی دیوار کے نقش و نگار ہیں۔ ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے، جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے، زبان کی تعلیم و تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے، اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اسکی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے، ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جا رہی ہے، جو اکثر اولیات سے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ ہلالی صاحب کہتے تھے کہ تحریری اور قلمی ”دخناسہ“ ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلاد عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں، اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلا ان کو پڑھتے ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کل سرمایہ اور جمع خرچ ہیں، عز ورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھا جائے، ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہئے، اس پر شیخ نے وارد العلوم میں مسلسل تقریریں کیں، اور اپنے مدعا کو دلائل سے ثابت کیا۔

دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ عربی و غریب کے فوائد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے، زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف دغو کے قواعد بے کار ہیں، مفردات،

کی مدد سے میں سنہ اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا اور اخبار خیالی میں جتنی قدرت حاصل ہوتی، ادب و زبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوتی۔

مصری دستاویزی ادب اور فضلاء کے مضامین پڑھ کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکھ دل پر بیٹھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خواندہ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سر مہر تھے، وہ اپنے اخبارات و رسائل کے کچھ صفحات میں روزانہ نکلتے ہیں، اور امیر شکیب ارسلان کے بقول عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا، وہ اس عصر کا عرب ادیب و صحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے، لیکن معنوی و ذہنی حیثیت سے ذوق و دماغ پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا، اور ہمارے ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان کے زیادہ سنجیدہ، زیادہ گہرے اور زیادہ طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول میں نشوونما پائی تھی، عربوں کے قوم پرست اور وطنی افکار، مغرب سے ذہنی مرعوبیت، اور خیالات کی سطحیت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا، اور ذہن نے اسکی پستی اور کمزوری صاف محسوس کی، ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا، اس حیثیت سے امیر شکیب ارسلان کی تحریروں اور خیالات میں نسبتاً کچھ گہرائی اور جنگل اور اسلامیت معلوم ہوتی لیکن امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص، اور علاج

الفاظ و جمل مکان کی آئین ہیں، اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجیری کا فن اگر سر سے اٹھیں نہ ہوں تو انجیزنگ اور اصول تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلالی صاحب سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مستند کتابیں اور عہد عباسی کے ادب کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں، اس کے لئے انہوں نے ابن قتیبہ کی الامامہ والسیارۃ ابن المقفع کی "کلیہ و دمنہ" ابو الفرج الاصبہانی کی کتاب "الاعانی" اور باخط کے رسائل کی سفارش کی۔

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا، ادھر ہلالی صاحب کا فیض عام تھا، ادھر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی عربی کا رسالہ "النصار" نکال رہے تھے، عربی زبان و تحریر، نقد و تبصرہ گویا اور دھنا بچھونا پور ہا تھا، مصری، شامی، عراقی اور مغربی (الجزائری و مراکشی) رسائل و جرائد تبادلہ میں آتے تھے، پڑھتے جاتے تھے۔ اور ان پر گفتگو رہتی تھی، یہ میرے عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا۔ عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے، اور عرب اساتذہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا، اس لئے نہیں کہ ہندوستانی علماء کے بقول (جو براہِ غلط فہمی ہے) یہ کسی جدید عربی میں ہوتے تھے بلکہ طرزِ ادب، اور اشتقاق کی واقفیت کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے، بھائی صاحب

کی تجویز میں اس وقت جس شخص کے خیالات و افکار میں نسبتاً زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی، اور جسکی فراست نے متاثر کیا وہ سید عبد الرحمن الکوہی کی تھی کتاب "ام القری" ہے، جواب پرانی ہو چکی ہے، اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں، لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ وہ قومیت عربیہ کے اولین نقیبوں میں ہیں، اور انہوں نے سب سے پہلے دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں میں بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی، دل چدکا ہو گیا اور عقیدت میں کمی آئی۔

۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۸ء میں رسالہ توحید امرتسر

میں جو مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی ادارت میں نکلا مشہور ہوا تھا۔ تیرہویں صدی کا مجدد اعظم کے عنوان سے حضرت سید احمد شہید کے متعلق مولوی محی الدین قصوری مرحوم کا ایک سلسلہ معنون شائع ہوا، بجائی صاحب کے حکم سے ۱۹۲۹ء - ۱۹۳۰ء میں میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو ہلالی صاحب کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے "النار" میں بھی شائع کیا، اور ترجمہ السید الامام احمد بن عرفان کے نام سے علامہ رسالہ کی شکل میں بھی چھاپ دیا، اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

میری مدرس تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا، اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیم کی "زاد المعاد"

میرا کتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی، دریافت کے کتب خانہ کی اتنی بہتر زندگی

ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے، اگر مجھے کبھی پورے ذخیرہ علمی سے محروم کر دیا جائے، اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے، تو میں کتاب اللہ اور زاد المعاد اپنے ساتھ رکھوں گا، اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے، اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتداءً شباب میں جو کتابیں فرشتہ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سب سے زیادہ موثر اور عسین کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب قیام الیل ہے، اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں، بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رخ بدل دیتی ہے، اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے موثر واقعات لکھے ہیں، اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پراثر تفسیر، اور قیام الیل کے فضائل جمع کئے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں، اور اپنا اثر کر جائیں، تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہ کی تفسیر سورة النہد نے بھی اس پر آشوب زمانہ میں دستگیری کی، یہ ادا حافظ ابن قیم کی "الجواب الکافی" نوجوانی میں بہترین نگران اور اتالیق، اور اخلاقی محتسب و ناصح ہیں، زمانہ تعلیم کے بے شعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور معلمین سے نفع اٹھانے اور ان کے احترام اور

طالب علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا، وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب تعلیم المتعلم ہے، اسی طرح تحصیل علم میں علوئے ہمت، عزیمت اور ذوق علم پیدا کرنے میں نواب صدر یار جنگ مولانا عبید اللہ رحمن خاں شہروانی کی کتاب "علمائے سلف" نے ہمیں گہرا کام دیا، اور دل و دماغ پر علمائے سلف کی عظمت و عزیمت کا نقش ثبت ہو گیا، میرے نزدیک ہر سچے طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اسکو حرز جان بنا کر رکھنا چاہئے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تصنیفات کو اچھے پڑھتے، ان کا ایک مسودہ "ارمغانِ احباب" کے نام سے ملتا تھا، جو انہوں نے اپنی ۶۶ سال کی عمر میں لکھا ہے، اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفرِ دل کا روزنامہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف لیکن اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردانِ خدا کی محبت اور دین کی پاشنی محسوس ہوئی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے اہل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا، جہاں والد مرحوم حضرت سیدنا لکھتے ہیں وہاں دل مجھوم جاتا تھا۔ اور دل ایک خاص کیفیت محسوس کرتا تھا۔

دوسری چیز جس نے حضرت اہل اللہ کی محبت و عقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا۔ جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علیؒ بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ ارشادِ رحمانی ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل رحمن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے کچھ حالات، حکایات و معجزات اور سلوک و طریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادیؒ میرے والد مرحوم کے شیخ تھے، اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکر خیر سنا تھا۔ اس روحانی تعلق اور ذہنی ربط سے کتاب ذوق و شوق سے پڑھی، محبت کے اشعار، اور عاشقانہ کلمات دل میں چبھ گئے، اور تیر و فشر کی طرح دل میں اتر گئے، اس سے کچھ پیشتر یا بعد والد مرحوم کا ایک مختصر سا رسالہ یا مقالہ جو "استفادہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، بار بار پڑھا تھا، اسی میں انہوں نے اپنے گنج مراد آبادیؒ کی حاضری کے حالات، اور وہاں کے مشاہدات، اور مولانا کے الطاف و عنایات کے واقعات قلم بند کئے تھے، اس نے مولانا کی محبت و عقیدت، اور اہل اللہ سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ و بزرگان دین کے معجزات کے مجموعے بھی نظر سے گزرے، ان مجموعوں میں

۱۔ یہ "فرمانہ پہلے رسالہ" معارف، اعظم گڑھ میں بالاقساط شائع ہوا۔ پھر انجمن ترقی اردو دہلی، اور مکتبہ ندوۃ العلماء کی طرف سے دہلی اور اس کے اطراف کے نام سے شائع ہوا۔

عنايات سے سرفراز ہوا، تو ان کی زبان سے دینی حقائق و نکات، اور سلوک و تصوف کی تاویل و تحقیقات سن کر عالم ہیرت میں پڑ گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ملفوظات و مجالس کے قلم بند کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی۔ اپنے علم و فہم کے مطابق یہ کہتے ہیں ذرا مبائعہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرصہ دراز سے تزکیہ و احسان، اور دینی حقائق کے سلسلہ میں ایسے بیش قیمت ملفوظات، اور ایسے گہرے علوم و مضامین سننے میں نہیں آئے۔

والغیب عند اللہ

دفعہ کل ذی علم علیم

طالب علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا۔ اور دو کتب خانے دیکھے، ایک زندہ و متکلم، ایک جامد و خاموش، زندہ کتب خانہ مولانا شاہ سلیم عطا صاحب، اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ، شاہ صاحب کے واسطے سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب، اور ابن عبد الہادی وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جا کر "احیاء العلوم مع تخریج عراقی" فضل علم السلف علی الملک، "دقائق الکونین" تلبیس ابلیس، "مختصر منہاج القاصدین" وغیرہ منگوائیں۔ تلبیس ابلیس کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی۔

حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ محبوب الہی حضرت خواجہ نظام الدین ادریاء کے ملفوظات "نوائد الغواہ" اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علی کے ملفوظات "وہ المعارف" کا قلب پر اثر پڑا، اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی، لیکن قلب نے واقعات، اور بے ساختہ گفتگو اور علوم کی گہری و نرمی محسوس کی۔

فلسفہ تصوف اور فلسفہ اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بہ کثرت ملتے ہیں، کبھی متاثر نہیں کیا، البتہ درد و محبت، اور سوز و گداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں، اور یہ تیر کم خطا جاتے تھے، درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔

ہم نے اپنے آشیانہ کیلئے

جو چھپے دل میں دہی تنگے لئے

بزرگوں کی مجالس و ملفوظات کے سلسلہ میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر یہ کہنے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ عرصہ کے بعد حبیب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اور ان کی التفات و

جملہ مجالس مکتبہ القرآن "مکتبہ کی طرف سے" صحیحہ باہل دل کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اور اس وقت تک اس کے حوالہ پیش نقل کچے ہیں۔ سہ آپ حضرت شاہ پیر محمد صاحب سلونی چشتی نظامی کی اولاد میں سے تھے، زندگی گمنامی میں بسر کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس حدیث کی خدمت میں شریعتی حیثیت رہنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن
نوثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی اور ادبی لحاظ کے
بغیر ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں، جنہوں نے
بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا
اور کوئی قابل ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصاب تعلیم کے متعلق اصلاحی و
تجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب و شیخ تقی الدین
ابوالی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا، دارالعلوم ندوۃ العلماء
کے مانول اور لٹریچر نے اس کا نشوونما کیا، ندوۃ العلماء
کا تخیل، اور دین و دنیا کی بہم آمیزی، اور علماء و اہل دین
کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس
نواب مدد یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب
شیرانی کے اس خطبہ صدارت سے وضاحت
و قوت کے ساتھ ہوا، جو موصوف نے ندوۃ العلماء
کے اجلاس ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء مکہ میں
پڑھا تھا، اور میں نے اسکو غور سے بعد میں
چھپا ہوا پڑھا، پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور
اطمینان بڑھتا رہا، اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی
عقائد و نظریات کا جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل
میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبداللہ صاحب
مرحوم بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی صحبتوں
اور مجلسوں میں پیدا ہوئی، جو اس سے براہ راست
واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے
باوجود اسکی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔

یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی
تہذیب و ثقافت کی فتمندی اور مغربی ماحول کے
اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا،
اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی، مولانا عبدالمجید
صاحب دریابادی کے ”سیح“ اور ”صدق“ کے
پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور
لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی
توجیہ میں ڈریسپر کی پرانی کتاب ”معرکہ مذہب و
سائنس“ (ترجمہ مولانا طغری علی خاں مرحوم) اور لکی
کی ”تاریخ اخلاق یورپ“ (ترجمہ مولانا عبدالمجید
صاحب۔ دریابادی) نے بڑی مدد دی، اور اس
سے بڑا مواد ملا جس سے اپنے مضامین و استدلال
میں بہت کام لیا، مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی
کے مضامین ترجمان القرآن اور ان کی کتاب ”تنقیحات“
نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی، مولانا
ابوالاعلیٰ کے ”ترجمان القرآن“ کے مضامین نے
طرز استدلال اور طرز تحریر پر بھی اثر ڈالا، اور ان
کی تحریروں نے ذوق و فکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی
نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی
و اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان
کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پرمغز چیز
محمد اسد صاحب کی کتاب (ISLAM AT THE
CROSS ROADS) معلوم ہوئی، جس کا لفظ لفظ

دل نشین ہوا، عرصہ دراز کے بعد ان کی دوسری فکر انگیز لیکن دلچسپ کتاب (ROAD TO MECCA) شائع ہوئی، جس کا عربی ترجمہ "الطریقۃ الی مکہ" انہوں نے اندراہ عنایت مجھے خود بھیجا، یہ اس اجمال کی تفصیل، اور اس نظریہ کی عملی تطبیق تھی، جو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں پیش کیا تھا، میں نے ان کی اجازت سے اس کا ترجمہ اور تلخیص "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب بروایائے حق، اور مناسب ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

۱۹۳۸-۳۹ء میں مصر کے فاضل مولف ڈاکٹر احمد امین کی "فجر الاسلام" جلد ۱ اور منہی الاسلام جلد ۲ کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ عہد نبوی اور عہد نبوی و عباسی کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی و علمی تاریخ ہے جس میں واقعات سے نتائج اخذ کئے ہیں جنہاں سے کلیات قائم کئے ہیں اور ہر دور اور حیات انسانی کے ان مختلف شعبوں پر مجموعی نگاہ ڈالی ہے، کتاب مصنف کی قوت ملاحظہ اور حسن استنتاج کا اچھا نمونہ ہے۔

اور اگرچہ موجودہ عصری و مغربی تاثرات سے کلیتہً پاک نہیں، اور اس کے مطالعہ سے ذخیرہ حدیث پر اعتماد کی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے۔ اور اسکی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہئے، مگر میری سادہ لوحی

کہتے، یا ناقدانہ نظر کی کمی کہ مجھے مصنف کی اس کمزوری کا پورا احساس اس وقت نہیں ہونے پایا اس کا صحیح احساس و علم اور اس سے اذیت اس وقت ہونی جب میں نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی فاضلانہ کتاب "السنة و مآثرها فی التشریع الاسلامی" پڑھی جس کے مطالعہ کی سفارش فن حدیث کے ہر طالب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین سے خیالات میں بڑا توار و معلوم ہوا، کئی جگہ حواشی پر اختلاف یا انہماک خیال کیا، یا مصنف کو بے اعتقاد و اودھی، لیکن سب سے زیادہ فائدہ جو ان کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا، وہ شگفتہ، شیریں اور علمی طرز تحریر کا ہے، جس میں احمد امین اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کے تذکرہ سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی عمومی عظمت دل و دماغ پر قائم ہوئی، تذکرہ اور الہلال کے ادبی سحر حلال نے مسحور کیا۔ ترجمان القرآن کی دوسری جلد سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے گوشے سامنے آئے، اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی، سورہ یوسف پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال، بلکہ ادب عالی کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔

جب ترجمہ قرآن اور تفسیر کی تدریس کی خدمت دارالعلوم میں سپرد ہوئی، تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حواشی کی قدر آئی، جن میں انہوں نے

مفسرین کے اقوال کا عطر اودان کی تحقیق کا وہ حصہ نقل کر دیا ہے، جس کو اس زمانہ کا سلیم ذہن آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے، اس میں مولانا کی سلامت فکر، حسن انتخاب، اور تحریکی شگفتگی بخوبی عیاں ہے، میں نے دیوبند کی ایک طاقت میں مولانا سے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، مولانا کو بڑی مسرت ہوئی، اور بعض صاحبوں سے اس کو نقل کیا، جدید معلومات و تحقیقات نے تفسیر کے سلسلہ میں جو نئے سوالات پیدا کر دیے ہیں ان کا حل تلاش کرنے میں، اور قرآنی اعجاز کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں ”تفسیر مجیدی“ اور اس کے مصنف مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے تفسیری مضامین و تحقیقات سے بڑی مدد ملی۔ اور اپنے مطالعہ و معلومات میں سچائی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی تمام تصنیفات نقد کامل عیار، اور علم و انشاء کے لحاظ سے معیار میں، لیکن اسی بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خطبات مدراس ہے، اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے، تو اس کو زندہ جاوید بنا دے اور اگر مقبول ہو، (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے) تو مغفرت کے لئے تنہا کافی ہے، بار بار مرے سے لے کر پڑھی، حدیث و میرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے، اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث

سیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی کتابوں میں بڑے معلومات اور مواد ہے، بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرز تحریر، اور بات سے بات نکالنے کی وجہ سے ہی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ ان کی کتابوں میں جی لگا۔ اور اپنے علم میں اضافہ ہوا خاص طور پر ان کی کتاب ”الغنی الخاتم“ سیرت پر بڑی اعلیٰ کتاب ہے، اسی طرح ان کی دوسری کتاب ”ہمارا قدیم نظام تعلیم و تربیت“ بڑی پر از معلومات اور مؤثر کتاب ہے، تیسری کتاب ”تدوین حدیث“ بڑی مبہرانہ، اور نکتہ درانہ تصنیف ہے، ان کا مضمون ”مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ“ بھی بڑی بصیرت و معلومات کا فدیہ بنا، اور اسی سے ان کے دوسرے مقالے جو ”الفرقان“ شاہ ولی اللہ فیر میں شائع ہوا تھا، تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آئے۔

”حیات جاوید“ ”وقار حیات“ اور ”تہذیب الاخلاق“ کے پرانے قائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی و سیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جسکی تکمیل ”حیات شبلی“ سے ہوئی، مولوی سید طفیل احمد صاحب کی ”حکومت خود اختیاری“ اور ”مسلمانوں کا روشن مستقبل“ سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی منزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ ہوئی، ہندوستان کی اسلامی، دینی و علمی تاریخ کا سب سے

سے کوئی استفادہ نہ کر سکا، لیکن اللہ ان کو
کروٹ کروٹ بہت نصیب کرے، وہ الیہ
علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں، کہ ساری عمر اس سے
استفادہ کا موقع ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال
مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ
کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ
پر نہیں پڑا، جتنا علامہ اقبالؒ کے کلام کا، غالباً
اسکی وجہ یہ ہے، کہ وہ ان خیالات و تمناؤں
کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست
ہو چکی ہیں۔ اقبال اور ان کے کلام پر اردو میں اتنی
کتابیں شائع ہوئی ہیں تو شاید کسی معاصر شخصیت
اور اس کے فکر پر شائع نہیں ہوئی، لیکن ان میں
سب سے زیادہ پر مغز اور روح پرور کتاب
ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ”روح اقبال“ معلوم
ہوئی۔

علامہ مرحوم سے ۱۳۵۴ھ میں دوسری
 ملاقات کی، اور کئی گھنٹے ان کے التفات
و ارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب
کے ایک رسالہ میں ”عارضہ ہندی کی خدمت
میں چند گھنٹے“ کے عنوان سے شائع ہوا،
بلاذعربہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی، اور ناشناسی
پر دل کھول کھول کر رہتا، اور ٹیگور کی قدر افزائی
پر غصہ آتا، علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر
میں پڑھے جانے کے لئے ایک مفصل و طویل

بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا، کبھی خیال نہیں آیا تھا،
حیدرآباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی، تو والد
مرحوم کی تصنیف اور سرمایہ حیات ”نزهة الخواطر“
کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں، ان
کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جتنی جاگتی
تاریخ آنکھوں کے سامنے آگئی، علماء و مشائخ
اہل درس و اہل تصنیف، اہل ذوق و اہل کمال
سلاطین و وزراء امراء و رؤساء کے ایسے حالات
اور ہندوستان کی علمی تاریخ کے ایسے قیمتی لوازم و
نکات رفت میں مل گئے، جن کے لئے سینکڑوں
کتابیں اٹھنے اور ہزاروں صفحات کھنڈگانے سے
بھی کام نہ چلتا۔ یہ ایک بہت بڑی ثقافت
اور معلومات کا خزانہ تھا، جس کو ہندوستان
کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو
نظر انداز نہیں کر سکتا، اور جس کے بغیر آدمی اپنے
ملک ہی میں اندھیرے میں رہ گیا، علمی طور پر کسی
کتاب کے سوا اور علمی ذخیرہ سے اتنا استفادہ
نہیں کیا، اور مضامین و تحریروں میں کسی سے اتنا
کام نہیں لیا جتنا ”نزهة الخواطر“ کی ان ضخیم آٹھ
جلدوں کے تاریخی معلومات سے بن کی تلاش
کے لئے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں
صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت، اور
نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہئے، اور
کس جگہ سے وہ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میری
مردمی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد

مصنوع علامہ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالم عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق ”روائع اقبال“ کے ذریعہ ہوئی، جس نے بلاد عربیہ کے نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی، ابتدائی استغراق انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شغف نگلی اچھی نہیں۔ اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے، اور جسکو جو کچھ ملا ہے، اسی سے ملا ہے۔

لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں موج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں، اور عالم اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اب بھی اسکو طاق و خود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صائب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب — ”مذہب و عقلیات“ پر نظر پڑی جو بہ قامت کہتر اور یقینیت بہتر“ کی صحیح مصداق ہے، ذوق و ذہن نے اسکو پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی فارسی، اور کوتاہی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا

جو مطالعہ میں بہت کام آیا، اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ، اور اسکی تاریخ پر جو کچھ ملتا آیا، پڑھا مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا ترزل و واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا، ان ہم الاخی بھائیوں — اور بڑے کذب و اباحہ و بییط و ابعلمہ و ملایا تم تاویلہ کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی، حافظ ابن تیمیہ کی سورۃ اخلاص“ اور ”کتاب النبوت“ کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو بچتہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلم و مربی میرے بڑے معلم ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم، جن کی اصابت رائے، خدا و سلامت فکر، استقامت، اور گہرا علم زندگی کی ہر منزل، اور ہر موڑ پر میرا دستگیر رہا، برابر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ”ازالۃ الخفاء“ کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے، لیکن نو عمری کی سطحیت اور کم سنی کی عجلت کی وجہ سے کبھی دو چار صفحے سے زیادہ نہ پڑھ سکا، دفتر اول کا پہلا مکتوب جو حضرت نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کو لکھا ہے، اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہ سلوک کے تجربات لکھے ہیں، ہمیشہ ہمت شکن ثابت ہوا، اور جس طرح بدشوق بچے ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ

اب حال میں اس کا ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں کے قلم سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کھنڈنے

تحقیقات قلم سے نکلی ہیں ان سے بڑا شرح صدر اور یقین کا اضافہ ہوا، نیز دور اکبری و جہانگیری میں دین کی نصرت و حمایت کے سلسلہ کے مکتوبات سننے وینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا۔ اور افسردہ قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی، انسانی تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ گزر چکا ہے، کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات کے مکتوبات میں پائی جن پر صدیاں گزر چکیں، مگر وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو عموماً کھنسنے کے وقت ہوتی ہے۔

میرے محترم دوست اور دینی کاموں میں رفیق کار مولانا محمد منظور صاحب لنہانی نے

”الفرقان“ کا شاہ ولی اللہؒ کی حقیقت مصنف کا عنوان اپنے لئے منتخب کیا، اس کے لئے ضروری تھا کہ شاہ صاحب کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے، کچھ پہلے دیکھی تھیں کچھ نہیں دیکھی تھیں، اس سلسلہ میں ”ازالۃ الخفاء“ کے بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی، یہ دینی نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا، انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہونگا، جتنا مکتوبات اور ”ازالۃ الخفاء“ سے علم کا چشمہ اُبلتا نظر آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ اور دوسرے سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے

پڑھ کر چھوڑ دیا کرتے ہیں میں بھی اس مکتوب کے چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا، لیکن ایک بار اس کا عزم کر لیا کہ مکتوبات کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا، چاہے بڑا حصہ سمجھ میں نہ آئے، چنانچہ اس کے چاروں دفتر پڑھے لفظ بہ لفظ دل لگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے بے استیادوی، قوت مطالعہ کی کمی، اور علوم عقلیہ و آلیہ کی بے بضاحتی قدم قدم پر عیاں گیر رہی، لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ع۔

آنچہ ساقی مارِ نخت عین الطاف است

اس عرصہ کے بعد حضرت شیخ شرف الدین نجی مینریؒ کے مکتوبات کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت مجدد اور حضرت مخدوم بہاری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم کھول کے سامنے آگیا، وہی نبوت کی قطعیت، مقام نبوت و منصب رسالت کی بلندی و برتری اور خصائص نبوت و انبیاء اور نبوت و ولایت کے لوازم و مابہ الاختیاز چیزوں کے متعلق ہر نکتے اور حقائق کھلے ہیں، ان پر وقت فکر کے لحاظ سے یونان و عجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان، اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء کے وادین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار نثار مکتوبات مجددی کے تذکرہ کے آخر میں سنت و بدعت کے بارے میں جو مجددانہ کلمات و

آجاتا ہے، آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت کے خصائص، نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ علمی جنگی کے ساتھ کیا لطف و لطافت میں ادب و شاعری سے کم ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے تلمیذ رشید اور پنجاب کے مشہور عالم و مصلح حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے پڑھی تھی، اور دماغ پر اسکی عقلیت، حکم استدلال، اور شاہ صاحب کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا، حجۃ اللہ البالغہ سے علمی و اصولی مباحث اور مشکمانہ و فلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی، اور اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اسکی تحقیقات سے اتنا متفق

نہیں، جتنا شاہ ولی اللہ صاحب ادران کی کتابوں سے، اگر اپنے فکر و مسلک کے لئے کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے، تو میں انہیں کا نام لے سکتا ہوں، اور درحقیقت ہمارا تعلیمی و فکری نسب و شجرہ انہیں پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نامور پوتا شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے، لیکن ان کی شہرہ آفاق اور سلم ذکاوت اور دفور علم کا اندازہ صرف "منصب امامت"

سے ہوا، جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی مختصر تصنیف "العقد الکبیر فی اصول التفسیر" (جس کو میں شاہ صاحب کی قلمی بیاضی کہتا ہوں) کے بعض علمی اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید کے مطالعہ و تفسیر میں بڑی رہنمائی کی، اور شاہ صاحب کے بعض مختصر جملوں، اور حقوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے، اور مطالعہ قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات کے مجموعہ "صراط مستقیم" (مرتبہ مولانا اسماعیل شہید مولانا عبدالحی) کو بہت دیر میں دیکھا، مگر تصوف کے اچھے ذخیرے اور ائمہ تصوف کے ملفوظات خصوصاً حضرات چشت کے پورے سلسلہ ملفوظات کے مطالعہ کے بعد دیکھا، اور معلوم ہوا کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی کتاب ہے، سلوک راہ نبوت، اور تقرب بالفرقان کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحب امام تھے، اور جو اس عصر کے لئے تزکیہ نفس، اور قرب الی اللہ کی سب سے آسان، بے خطر اور وسیع شاہراہ ہے، طریقت و حقیقت اور سلوک و تربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، وہ خدا داد ذکاوت، علوم نبوت سے فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت، اور وقت نظر

کی دلیل ہے، اہل ظاہر و باطن اور اہل معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو خاکہ کیا ہے، اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں، وہ ان کی اعلیٰ سلامت طبع، دماغی توازن و اعتدال، اور میانہ روی کی شاہد ہیں، کاش! اس کتاب کی شایان شان خدمت ہوتی، اور نئے طرز پر مرتب کر کے پیش کی جاتی۔

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی اور صناعی علوم، اور تصنیفات سے پیدا ہو جاتی ہے، دور ہوئی، اس کی بری بھلی تیز پیدا ہوئی، کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم و حقائق ادا کئے جاسکتے ہیں، اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں، جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کئے جاسکتے، ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز بڑا اور چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن بڑا اور خوانشی نہ ہوں۔

اس عصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (م ۱۳۶۳ھ) سے ظاہر، قرآن کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبت سہولت ہوئی، حسن الفاظ اور حسن ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاشی مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی، میں نے ایک مرتبہ پر عرض کیا، کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہید

کے حالات نہ لکھے ہوتے، اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی، مولانا نے اسکو پسند فرمایا، اور دوسروں سے نقل کیا۔ میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحب کے مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے، وسی و متداول، اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں، بعض لفظ بہ لفظ دیکھیں، لیکن اصل فائدہ متن قرآن کے ساوہ اور بار بار کے پڑھنے سے ہوا، اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے، کہ قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی و لسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علوم نبوت و مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت و زندگی کائنات خلاقہ القرآن کا پرتو ہو، اور جنہوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علی کا قول) کہنے والے کی قلبی و ذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو ان حضرات کے علوم کی تازگی و شگفتگی، بے آمیزی اور نکھار اور علم کی وسعت و گہرائی سے قرآن مجید کے الفاظ کی وسعت و عمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے۔ کئی الفاظ جو "لسان العرب" اور مفردات عربیہ سے اور کئی آیات جو زخشری کی ادبی تفسیر کشافہ امام رازی کی عقلی تفسیر فتوح الغیب اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں، الفاظ و معانی میں نئی وسعت

ہوتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
دنیا ملک پہنچایا، اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید
میں اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔
دادیم ترا از منزل مقصود نشان
گر مانہ رسیدیم شاید تو رسی



ماہنامہ الحق پر ایک تازہ تبصرہ

اکوڑہ خشک ضلع پشاور کی مشہور و معروف دینی
درس گاہ دارالعلوم حقانیہ جناب شیخ الحدیث مولانا
عبدالحق مدظلہ کے زیر اہتمام جو اس کے بانی و مہتمم ہیں،
دریائے ملک کے پار کے تمام علاقوں میں دینی تعلیم کی
نشر و اشاعت کے سلسلہ میں وہی خدمات سرانجام
دے رہی ہے جو ایک عرصہ دراز تک بعلظیم دارالعلوم
دیوبند دیتا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اطراف میں
قیام پاکستان کے بعد یہ درس گاہ صحیح معنوں میں
دارالعلوم دیوبند کی جانشین ثابت ہوئی ہے۔

ماہنامہ الحق اس درس گاہ کا ترجمان ہے۔ اس کے
مدیر سمیع الحق صاحب اس قدر شستہ و شگفتہ اردو زبان
لکھتے ہیں اور اس ماہنامہ کو اتنی عمدگی اور سلیقہ سے مرتب
کرتے ہیں کہ الحق ملک کے چوٹی کے دینی رسالوں میں
شمار کیا جاسکتا ہے۔ پیش نظر شمارے میں دینی و سیاسی دونوں
انواع کے مضامین ہیں اور نہایت اعلیٰ معیار کے ہیں۔

(امروز - لاہور - ۲۶ فروری ۱۹۷۲ء)

اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔
دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن
راستوں پر چلے ہیں ان پر چلنے سے قرآن مجید
کھلتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان
کی گئی ہیں، ان کا احساس ہوتا ہے، قوموں نے اپنے
پیغمبروں کو جواب دے دیے ہیں، کان وہی آوازیں سنتے
ہیں، اور آنکھیں وہی نظر دیکھتی ہیں، جو اشکالات
اور شبہات علم کلام کی کتابوں نے، اور کتابی مطالعہ
نے فرضی طریقہ پر پیدا کر رکھے ہیں، وہ وہاں
بے حقیقت ہو جاتے ہیں، قرآن مجید کے سمجھنے
کے یہ دو طبعی طریقے ہیں۔

سنا ہے کہ جب قرآن مجید میں آدمی کا
جی لگنے لگتا ہے، تو انسانی تصنیفات سے جی
گھبرانے لگتا ہے، انسانی کتابیں، انسانی تحریریں
انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے
لگتی ہیں، ادبار اور حکماء اور مفکرین کی باقیں طفلانہ
اور عامیانہ نظر آتی ہیں، جن میں کوئی گہرائی اور بے شکلی
نہیں معلوم ہوتی، سفید کاغذ پر پیچھے ہوئے سیاہ
نقش و نگار کاغذی بھول معلوم ہوتے ہیں، جن
میں رنگ ہے خوشبو نہیں، انسان کا علم احتلا
اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس کا دیر تک
پڑھنا ذوق اور مدح پر بار ہوتا ہے، ہر وہ چیز
جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ
اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے، تسکین صرف
وہی و نبوت کے راستہ سے آتے ہوئے علم سے